ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 0202

Program:

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ مطالعہ پاکستان

کورس: مطالعہ پاکستان (202)

سطح / پروگرام: میٹرک

سمسٹر: خزاں 2026ء (2026Autumn)

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 3)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 40

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Reference &Study For—SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ حل شدہ رہنما صرف مطالعے اور حوالے کے لیے ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ مشق اپنے الفاظ میں، کتاب کا مطالعہ کر کے خود لکھیں؛ اس رہنما کو ہو بہو نقل کرنا تعلیمی لحاظ سے درست نہیں اور یونیورسٹی کی ہدایات کے بھی خلاف ہے۔

سوال نمبر 1

حضرت شاہ ولی اللہ کی مسلم معاشرے کی بقا کے لیے اقدامات کا تجزیہ کریں اور ان کی تحریک کے اثرات بیان کریں۔ (نمبر: 20)

تعارف

برصغیر کی تاریخ میں اٹھارویں صدی مسلمانوں کے سیاسی زوال کی صدی تھی۔ 1707ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت تیزی سے بکھرنے لگی، صوبے خود مختار ہوتے گئے، مرہٹے، سکھ اور جاٹ قوتیں ابھر آئیں اور انگریز تجارتی کمپنی آہستہ آہستہ سیاسی طاقت بنتی گئی۔ ایسے ماحول میں مسلمان صرف سیاسی طور پر کمزور نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا مذہبی، اخلاقی اور سماجی ڈھانچہ بھی انتشار کا شکار تھا۔ فرقہ واریت، باہمی اختلافات، تعلیم سے دوری اور معاشی بدحالی نے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اسی نازک دور میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703ء تا 1762ء) نے اصلاح و احیا کی وہ عظیم تحریک شروع کی جس نے مسلمان معاشرے کو فکری بنیاد فراہم کی اور آنے والی صدیوں کی تحریکوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اس جواب میں ان کے افکار کا تجزیہ اور ان کی تحریک کے اثرات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔



شکل: زوال سے بیداری تک — اہم تاریخی مراحل (انگریزی عنوانات کے ساتھ حاکہ)

شاہ ولی اللہ کا دور اور پس منظر

شاہ ولی اللہ دہلی کے معروف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم مدرسہ رحیمیہ کے بانی تھے، جہاں نوجوان ولی اللہ نے قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور عربی و فارسی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ حجاز مقدس گئے اور وہاں کے جلیل القدر محدثین سے علم حدیث حاصل کیا۔ واپسی پر انہوں نے دیکھا کہ دہلی کا معاشرہ سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ فکری جمود کا بھی شکار ہے۔ علما کے درمیان فقہی اختلافات نے شدت اختیار کر لی تھی، عوام دین کی اصل روح سے دور ہو کر رسم و رواج اور توہمات میں الجھ گئے تھے، اور حکمراں طبقہ عیش و عشرت میں مبتلا تھا۔ شاہ صاحب نے تشخیص کی کہ مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ صرف تلوار یا اقتدار کا نہیں، بلکہ علم، عقیدے کی درستگی، اخلاقی اصلاح اور معاشرتی انصاف کا ہے۔ یہی تشخیص ان کی پوری تحریک کی بنیاد بنی، اس لیے ان کی تحریک کو محض مذہبی نہیں بلکہ ایک جامع اصلاحی تحریک سمجھنا چاہیے۔

قرآن و حدیث کی طرف رجوع اور علمی اقدامات

شاہ ولی اللہ کا سب سے بنیادی اقدام مسلمانوں کو ان کے اصل مآخذ یعنی قرآن مجید اور سنت کی طرف واپس لانا تھا۔ انہوں نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو اس دور کی علمی زبان تھی، اور ان کے صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر نے اردو میں ترجمہ کر کے قرآن کو عام پڑھے لکھے لوگوں کی پہنچ میں لا دیا۔ اس قدم کی اہمیت اس سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اس سے پہلے قرآن کا فہم چند علما تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے امام مالک کی موطا کو درس میں بنیادی حیثیت دی اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسلامی احکام کی حکمتوں اور معاشرتی مقاصد کو عقلی و سماجی دلائل سے واضح کیا۔ ان کے نزدیک زکوٰۃ، سود کی ممانعت اور عدل جیسے احکام کا مقصد ایک متوازن اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنا تھا۔ مدرسہ رحیمیہ میں انہوں نے ایسے علما کی نسل تیار کی جنہوں نے آگے چل کر برصغیر میں علم کی روشنی پھیلائی۔ اس طرح ان کا علمی کام معاشرے کی بقا کے لیے فکری بنیاد فراہم کرنے کی کوشش تھا۔

فرقہ واریت کا خاتمہ اور اعتدال کی راہ

شاہ ولی اللہ کے عہد میں مسلمان مختلف فقہی و کلامی اختلافات میں بٹے ہوئے تھے اور یہ اختلافات بسا اوقات شدت اور تشدد کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ شاہ صاحب نے اس روش کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے فقہی مسائل میں اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی اور یہ اصول دیا کہ فروعی اختلافات کو باہمی دشمنی کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ ان کی تصنیف الانصاف اسی مزاج کی عکاس ہے جس میں انہوں نے ائمہ کے اختلاف کی وجوہات کو علمی دیانت سے بیان کیا۔ انہوں نے تقلید کے جامد رویے کی بھی اصلاح چاہی اور اجتہاد کے دروازے کو اصول کے اندر رہ کر کھلا رکھنے کی حمایت کی۔ اس اعتدال پسندی کا اثر یہ ہوا کہ بعد کے مصلحین نے فرقہ وارانہ تنگ نظری کے بجائے امت کی وحدت کو اپنا ہدف بنایا۔ آج کے تناظر میں بھی ان کا یہ پیغام اہم ہے کہ اختلاف رائے علم کی زندگی ہے، مگر اسے انتشار اور نفرت میں بدل دینا معاشرے کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا ان کی تحریک کا یہ پہلو مسلم معاشرے کی اندرونی یکجہتی کی حفاظت کے لیے وقف تھا۔

سیاسی و معاشی اصلاح کی کوششیں

شاہ ولی اللہ صرف مدرسے کے عالم نہیں تھے؛ انہوں نے اپنے عہد کی سیاست کا بھی گہرا مشاہدہ کیا۔ جب مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے دہلی اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تو شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو خطوط لکھ کر مداخلت کی دعوت دی، جس کے نتیجے میں 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی اور مرہٹہ طاقت کو شدید دھچکا لگا۔ مؤرخین اس اقدام پر بحث کرتے ہیں، مگر اس کا مقصد ان کے نزدیک مسلمانوں کی سیاسی بقا کی حفاظت تھا۔ اسی طرح انہوں نے حکام کو معاشی انصاف کی تلقین کی۔ حجۃ اللہ البالغہ میں انہوں نے دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو معاشرتی فساد کی جڑ قرار دیا اور محنت کش طبقے کے حقوق کی حمایت کی۔ ان کے خطوط اور مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امراء کی عیش پرستی اور عوام کی غربت کے تضاد کو سلطنت کے زوال کا سبب سمجھتے تھے۔ یوں ان کی تحریک میں سیاست اور معیشت کی اصلاح بھی شامل تھی، اگرچہ ان کا اصل میدان علم و فکر تھا۔

تحریک کے اثرات: اگلی صدیوں پر اثرات

شاہ ولی اللہ کی تحریک کے اثرات ان کی وفات کے بعد زیادہ واضح ہوئے۔ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے دہلی میں علمی و اصلاحی کام کو جاری رکھا اور جب انگریزی اقتدار مضبوط ہوا تو انہوں نے ہندوستان کے بدلے ہوئے سیاسی حالات پر فکری رہنمائی فراہم کی۔ شاہ صاحب کے شاگردوں اور خاندان سے وابستہ بزرگوں نے جہاد و اصلاح کی تحریکوں کو متاثر کیا؛ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک اسی فکری سلسلے سے جڑی ہوئی سمجھی جاتی ہے جس نے بنگال اور سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی بیداری پیدا کی۔ دوسری طرف ان کی علمی روایت نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کی فکری بنیادوں کو بھی متاثر کیا۔ تراجم قرآن نے عام مسلمان کو اپنے دین سے براہ راست جوڑا اور یہ سلسلہ بعد کی تمام اصلاحی و تعلیمی تحریکوں کے لیے مثال بنا۔ سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہوا کہ سیاسی اقتدار چھن جانے کے باوجود علم، عقیدہ اور تہذیب کی حفاظت سے قوم زندہ رہ سکتی ہے۔ یہی شعور بعد میں سرسید کی تعلیمی تحریک اور پھر تحریک پاکستان کی فکری تیاری میں کام آیا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے مسلمان معاشرے کی بقا کا حل اقتدار کی فوری بحالی میں نہیں بلکہ علم کی اشاعت، قرآن و سنت سے تعلق کی تجدید، فرقہ واریت کے خاتمے، اخلاقی و معاشی انصاف اور سیاسی صورت حال کی درست تشخیص میں تلاش کیا۔ ان کے اقدامات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ وہ ایک مصلح، محدث، ماہر سماجیات اور دور اندیش مفکر تھے جنہوں نے زوال پذیر معاشرے کو فکری زندگی عطا کی۔ ان کی تحریک کے اثرات دیوبند، تحریک مجاہدین اور بعد کی اصلاحی تحریکوں تک پھیلے اور آج بھی ان کی تعلیمات اعتدال، علم دوستی اور معاشرتی انصاف کا پیغام دیتی ہیں۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری بقا کی کہانی شاہ ولی اللہ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔

سوال نمبر 2

برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کریں اور مسلمانوں کو درپیش سیاسی اور معاشی مسائل کا احاطہ کریں۔ (نمبر: 20)

تعارف

برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ صدیوں تک مختلف ادوار میں حکمرانی کی، لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان کی سیاسی طاقت ختم ہو گئی، معیشت کمزور پڑ گئی اور تعلیمی و سماجی میدان میں بھی وہ دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ یہ زوال کسی ایک واقعے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اندرونی کمزوریوں اور بیرونی تبدیلیوں کے طویل سلسلے نے مل کر اسے پیدا کیا۔ ایک طرف مغل سلطنت کی مرکزی طاقت بکھر گئی، تو دوسری طرف یورپی تجارتی کمپنیاں جدید تنظیم، سمندری طاقت اور چالاک سفارت کاری کے ساتھ وارد ہوئیں۔ اس جواب میں پہلے زوال کے بڑے اسباب بیان کیے جائیں گے اور پھر ان سیاسی اور معاشی مسائل کا احاطہ کیا جائے گا جن کا سامنا انگریزی دور میں مسلمانوں کو کرنا پڑا۔

سیاسی انتشار اور مرکزی حکومت کا زوال

زوال کا پہلا اور بنیادی سبب سیاسی انتشار تھا۔ اورنگ زیب کے بعد آنے والے حکمران عموماً نااہل، عیش پسند یا باہمی جھگڑوں میں مبتلا رہے۔ دربار میں امرا کی گروہ بندیاں عام ہو گئیں، صوبوں کے گورنر خود مختار بن بیٹھے اور تخت کے لیے سازشیں معمول بن گئیں۔ اس کمزوری سے مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں نے فائدہ اٹھایا اور شمالی ہندوستان

عملاً ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اسی خلاء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے تجارت، پھر دیوانی اور بالآخر فوجی بالادستی حاصل کر لی۔ پلاسی (1757ء) اور بکسر (1764ء) کی جنگوں کے بعد بنگال جیسی زرخیز ریاست کمپنی کے قبضے میں چلی گئی جو برصغیر کی فتح کی کنجی ثابت ہوئی۔ مسلمان حکمرانوں کے پاس نہ جدید فوجی تنظیم تھی، نہ بحری طاقت، اور نہ ہی سفارتی اتحاد کی صلاحیت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے ریاستیں گرتی گئیں اور 1857ء کے بعد مغل بادشاہت کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔

فوجی و تکنیکی پسماندگی اور تعلیم سے غفلت

دوسرا بڑا سبب سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید تعلیم سے غفلت تھا۔ جس دور میں یورپ میں سائنسی انقلاب آ رہا تھا، چھاپہ خانہ، جدید اسلحہ سازی اور بحری جہاز رانی ترقی کر رہی تھی، برصغیر کے حکمران اور اشرافیہ پرانی روایتوں میں مگن رہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے زیادہ تر دینی علوم تک محدود ہو گئے اور جدید ریاضی، طب، جغرافیہ اور انجینئرنگ کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ انگریزوں نے جب جدید اسکول اور کالج قائم کیے تو ابتدا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ان سے فاصلہ رکھا، جس کی وجہ دینی تحفظات بھی تھے اور انگریز سے نفرت بھی۔ اس کے برعکس ہندو برادری نے نئے نظامِ تعلیم سے جلد فائدہ اٹھایا اور ملازمتوں و تجارت میں آگے نکل گئی۔ یہ تعلیمی خلا آہستہ آہستہ سیاسی و معاشی خلا بن گیا، کیونکہ جدید ریاست کی ملازمتیں، عدالتیں اور تجارتی ادارے انہی لوگوں کے ہاتھ میں آئے جو نئی زبان اور نئے علم سے واقف تھے۔

معاشی زوال: جاگیرداری، تجارت سے دوری اور کمپنی کی لوٹ

معاشی میدان میں زوال کی وجوہات بھی گہری تھیں۔ مغل دور کے آخر میں جاگیرداری نظام بگڑ چکا تھا، کسانوں پر ٹیکس کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور امن و امان کی خرابی سے تجارت اور دستکاری متاثر ہو رہی تھی۔ کمپنی کے اقتدار کے بعد بنگال کی دولت بڑے پیمانے پر انگلستان منتقل ہوئی، جسے مؤرخین دولت کے بہاؤ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مقامی دستکاریاں، خصوصاً بنگال کی ململ اور کپڑے کی صنعت، مشینی مال کی آمد اور کمپنی کی پالیسیوں سے تباہ ہوئیں۔ مسلمان کاریگر اور تاجر اس تبدیلی سے شدید متاثر ہوئے کیونکہ وہ بڑی تعداد میں انہی پیشوں سے وابستہ تھے۔ زمین داری نظام اور نئے بندوبست نے بھی بہت سے مسلم زمیندار خاندانوں کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ تجارت کے بڑے مراکز

اور بیزکاری کا نظام آہستہ آہستہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس معاشی کمزوری نے سیاسی کمزوری کو مزید گہرا کیا، کیونکہ بغیر وسائل کے نہ تعلیم پھیل سکتی تھی اور نہ سیاسی تنظیم کھڑی ہو سکتی تھی۔

1857ء کے بعد سیاسی مسائل

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی مسائل سنگین اختیار کر گئے۔ انگریز حکومت نے اس بغاوت کا بڑا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا، کیونکہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اس تحریک کا علامتی مرکز تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملازمتوں، فوج بھرتی اور حکومتی اعتماد سے بڑی حد تک باہر رکھا گیا۔ دہلی اور متحدہ صوبوں میں ان کی جائیدادیں ضبط ہوئیں اور ان کا سماجی وقار مجروح ہوا۔ سیاسی مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلمان قیادت کے سامنے کوئی واضح راستہ موجود نہ تھا: ایک طرف وفاداری اور تعاون کی حکمت عملی تھی جس کی سر سید احمد خان نے وکالت کی، اور دوسری طرف مزاحمت اور بائیکاٹ کی روایت۔ کانگرس کے قیام (1885ء) کے بعد نمائندگی کا سوال بھی پیچیدہ ہوا، کیونکہ مسلمان اقلیت میں تھے اور مشترکہ انتخابی نظام میں انہیں اپنی شناخت اور حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ یہی سیاسی مسائل آگے چل کر جداگانہ انتخاب، مسلم لیگ اور پھر دو قومی نظریے کی صورت میں منظم مطالبات بنے۔

معاشی مسائل کا تسلسل اور اصلاح کی کوششیں

انیسویں صدی کے آخر تک مسلمانوں کے معاشی مسائل ایک اجتماعی بحران کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی آبادی کے تناسب سے بہت کم تھی، تجارت و صنعت میں وہ پیچھے تھے، اور کسان طبقہ سود خور نظام اور لگان کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ بنگال میں مسلم کسانوں کی اکثریت ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں کے زیر اثر تھی جس سے طبقاتی کشمکش نے فرقہ وارانہ رنگ بھی اختیار کیا۔ ان حالات میں اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں۔ سر سید نے علی گڑھ میں تعلیمی ادارہ قائم کر کے جدید تعلیم کو راستہ دیا، انجمن حمایت اسلام اور دیگر تنظیموں نے یتیم خانے، اسکول اور فلاحی کام شروع کیے۔ بعد میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی سیاسی و معاشی نمائندگی کو اپنا پروگرام بنایا۔

ان کوششوں سے یہ سبق ملتا ہے کہ زوال کا علاج تعلیم، تنظیم اور معاشی خود انحصاری میں تھا، محض ماضی کی عظمت کے تذکرے میں نہیں۔ یہی بیداری بالآخر تحریک پاکستان کی سماجی بنیاد بنی۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کا زوال مرکزی حکومت کی کمزوری، مالی انتشار، فوجی و سائنسی پسماندگی، تعلیم سے غفلت اور معاشی ڈھانچے کی تباہی کا مجموعی نتیجہ تھا، جس پر انگریزی استعمار نے کاری ضرب لگائی۔ 1857ء کے بعد انہیں سیاسی بے اعتمادی، ملازمتوں سے محرومی اور نمائندگی کے پیچیدہ سوال کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ معاشی میدان میں دستکاری کی تباہی، زمین کے مسائل اور تجارت سے پسماندگی نے انہیں مزید کمزور کیا۔ تاہم اس زوال کے احساس نے اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں کو جنم دیا جنہوں نے بکھری ہوئی قوم کو دوبارہ منظم کیا اور بالآخر ایک آزاد وطن کے مطالبے تک پہنچایا۔

سوال نمبر 3

جنگ آزادی 1857 کے مذہبی اور معاشرتی اسباب کا تجزیہ کریں۔ (نمبر: 20)

تعارف

1857ء کی جنگ آزادی برصغیر کی تاریخ کا وہ موڑ ہے جس نے انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں اور اس کے بعد پورا سیاسی نظام بدل گیا۔ کمپنی کے لشکروں سے شروع ہونے والی یہ بغاوت دیکھتے ہی دیکھتے شمالی اور وسطی ہندوستان کے بڑے حصے میں پھیل گئی اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ کسان، زمیندار، دستکار اور عام شہری بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مؤرخین نے اس کے کئی اسباب بیان کیے ہیں: سیاسی ناانصافی، معاشی استحصال اور فوجی ناراضی کے ساتھ ساتھ مذہبی اور معاشرتی اسباب کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس

جواب میں خاص طور پر مذہبی اور معاشرتی اسباب کا تجزیہ پیش کیا جائے گا، کیونکہ یہی وہ اسباب تھے جنہوں نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا اور مختلف طبقات کو ایک ہی محاذ پر اکٹھا کر دیا۔

مذہبی مداخلت کا احساس اور عیسائی تبلیغ

انیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ انہیں کمپنی کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی اور بعض اعلیٰ افسران کھلے عام مقامی مذاہب پر تنقید کرتے اور تبدیلی مذہب کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسکولوں، اسپتالوں اور پریس خانوں کے ذریعے تبلیغ نے عام مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دلوں میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ حکومت ان کے دین و دھرم کو مٹانا چاہتی ہے۔ 1813ء کے چارٹر کے بعد مشنریوں کو باقاعدہ اجازت ملی اور 1850ء کے ایک قانون نے مذہب تبدیل کرنے والوں کے وراثتی حقوق محفوظ کر دیے، جسے عوام نے تبدیلی مذہب کی سرکاری حوصلہ افزائی سمجھا۔ اس ماحول میں چھوٹی چھوٹی پالیسیوں کو بھی مذہبی سازش کے رنگ میں دیکھا جانے لگا۔ یاد رہے کہ یہ تجزیہ اس دور کے عوامی تاثر کو بیان کرتا ہے؛ مذہبی معاملات میں کسی حتمی شرعی رائے کے لیے اہلِ علم سے رجوع ہی درست طریقہ ہے۔

چربی والے کارتوس: فوری محرک

جنگ کا فوری سبب نئے اینفیلڈ رائفل کے کارتوس بنے، جن کے بارے میں یہ خبر پھیلی کہ ان پر گائے اور سور کی چربی لگی ہے اور انہیں دانتوں سے کھولنا پڑتا ہے۔ ہندو سپاہی کے لیے گائے مقدس تھی اور مسلمان سپاہی کے لیے سور حرام تھا، لہٰذا دونوں کے لیے یہ کارتوس دین دشمنی کی علامت بن گیا۔ کمپنی کی وضاحتوں پر کسی نے اعتبار نہ کیا، کیونکہ اعتماد کا رشتہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ میرٹھ میں کارتوس سے انکار کرنے والے سپاہیوں کو قید اور بے عزتی کی سزا دی گئی جس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ 10 مئی 1857ء کو میرٹھ سے بغاوت شروع ہوئی اور سپاہی دہلی پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما بنا بیٹھے۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی جذبات اس دور کی سیاست میں کتنی گہری حیثیت رکھتے تھے اور حکمران ان سے بے خبر رہ کر کتنی بڑی غلطی کر رہے تھے۔

معاشرتی اصلاحات اور روایات سے ٹکراؤ

کمپنی حکومت نے کچھ سماجی اصلاحات بھی متعارف کرائی تھیں، مثلاً ستی کی ممانعت (1829ء)، بیواؤں کی دوبارہ شادی کی اجازت (1856ء) اور انگریزی تعلیم کا فروغ۔ ان میں سے بعض اصلاحات انسانی ہمدردی کے اعتبار سے قابلِ تعریف تھیں، لیکن جس انداز سے ایک غیر ملکی حکومت انہیں نافذ کر رہی تھی، اس نے قدامت پسند طبقات میں یہ تاثر پیدا کیا کہ ان کی تہذیب اور خاندانی نظام پر حملہ ہو رہا ہے۔ زمین کے نئے بندوبست اور لگان کی سختی نے زمینداروں اور کسانوں کو بھی ناراض کیا تھا۔ اودھ کا الحاق (1856ء) ایک اور کاری ضرب تھی: وہاں کے سپاہی بڑی تعداد میں کمپنی کی فوج میں تھے اور ان کے خاندانوں کی زمینیں اور مراعات متاثر ہوئیں۔ اس طرح معاشرتی بے چینی فوجی صفوں تک پہنچ گئی۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اصلاح بذاتِ خود مسئلہ نہیں تھی؛ مسئلہ غیر ملکی حاکم کی تحکّم پسندی اور مقامی جذبات کی بے توقیری تھا۔

علما، زمینداروں اور عام طبقات کا کردار

جنگ میں معاشرے کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے دکھ کے ساتھ حصہ لیا۔ دہلی، لکھنؤ، بریلی اور دیگر مراکز میں علما نے جہاد کے فتوے دیے اور عوام کو مزاحمت پر آمادہ کیا؛ تاہم انفرادی فتووں کی شرعی حیثیت کا فیصلہ اہلِ علم کا کام ہے، یہاں مقصد صرف تاریخی کردار کا بیان ہے۔ ملکہ لکشمی بائی، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے اور بیگم حضرت محل جیسی شخصیات نے سیاسی قیادت فراہم کی۔ زمیندار اپنی کھوئی ہوئی جاگیروں کے لیے لڑے، کسان لگان کے ظلم کے خلاف اٹھے، اور دستکار اپنی تباہ شدہ صنعتوں کا بدلہ چاہتے تھے۔ اس ہمہ گیر شرکت سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1857ء صرف سپاہیوں کی بغاوت نہیں تھی بلکہ ایک معاشرتی دھماکا تھا جس میں مذہبی شناخت، معاشی محرومی اور سیاسی غلامی کا احساس گھل مل گیا تھا۔ اگرچہ تنظیم اور مرکزی قیادت کی کمی نے اسے ناکامی سے دوچار کیا، مگر اس نے ثابت کر دیا کہ غیر ملکی اقتدار عوامی رضا کے بغیر قائم ہے۔

نتائج اور تاریخی اہمیت

جنگ کی ناکامی کے نتائج بہت سخت تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں قتلِ عام ہوا، بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا، مغل سلطنت باقاعدہ ختم ہو گئی اور 1858ء میں اقتدار کمپنی سے براہِ راست برطانوی تاج کو منتقل ہو گیا۔ حکومت نے اس کے بعد مذہبی معاملات میں عدمِ مداخلت کی پالیسی کا اعلان بھی کیا اور فوج کی تنظیمِ نو اس انداز سے کی گئی کہ مستقبل میں مشترکہ بغاوت مشکل ہو جائے۔ مسلمانوں پر اس کا خاص بوجھ پڑا کیونکہ انہیں بغاوت کا اصل ذمہ دار سمجھا گیا۔ اس کے باوجود 1857ء کی اہمیت کم نہیں ہوتی: یہ

برصغیر کے عوام کی آزادی کی پہلی بڑی مشترکہ کوشش تھی جس میں ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر لڑے۔ بعد کی آزادی کی تحریکوں نے اسی قربانی سے تحریک حاصل کی۔ مذہبی و معاشرتی اسباب کا تجزیہ ہمیں سکھاتا ہے کہ کوئی بھی حکومت عوام کے عقائد، روایات اور عزت نفس کو نظر انداز کر کے پائیدار نہیں رہ سکتی۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے مذہبی اسباب میں مشنری کوششوں سے پیدا ہونے والا عدم اعتماد، سماجی قوانین کو دین میں مداخلت سمجھنا اور چربی والے کارتوس کا واقعہ نمایاں تھے، جبکہ معاشرتی اسباب میں روایات سے ٹکراؤ، اودھ کا الحاق، زمین و کسان کے مسائل اور طبقات کی عمومی بے چینی شامل تھی۔ یہ اسباب تنہا تنہا شاید بغاوت نہ پیدا کرتے، مگر جب یہ سیاسی و معاشی ناراضی سے جڑ گئے تو ایک عظیم دھماکا ہوا۔ اس جنگ نے اگرچہ فوری آزادی نہ دلائی، لیکن اس نے استعمار اور برصغیر کے عوام کے تعلق کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا اور آزادی کی جدوجہد کی پہلی بنیاد رکھ دی۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 4

مسلم لیگ کے قیام کے اسباب اور مقاصد بیان کریں۔ (نمبر: 20)

تعارف

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں ہوا۔ یہ واقعہ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں بنیادی سنگ میل ہے، کیونکہ اس سے پہلے مسلمانوں کی کوئی ملک گیر سیاسی جماعت موجود نہیں تھی جو ان کے حقوق کی ترجمانی کر سکے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان تعلیمی، معاشی اور سیاسی تینوں میدانوں میں دشواریوں کا شکار تھے۔ کانگرس اگرچہ قومی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی تھی، لیکن مسلمانوں کی بڑی تعداد محسوس کرتی تھی کہ ان کے مخصوص مسائل وہاں پوری

توجہ نہیں پاتے۔ اس جواب میں مسلم لیگ کے قیام کے اسباب اور اس کے ابتدائی مقاصد بیان کیے جائیں گے اور ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ یہ جماعت آگے چل کر کس طرح تحریکِ پاکستان کی رہنما بنی۔

پس منظر: علی گڑھ تحریک اور سیاسی بیداری

مسلم لیگ کے قیام کی فکری زمین سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک نے تیار کی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور یہ شعور دیا کہ ہندوستان میں مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں جن کے مذہبی، تہذیبی اور سیاسی مفادات مختلف ہیں۔ 1867ء کے اردو ہندی تنازع نے انہیں قائل کر دیا کہ اکثریت کے ساتھ مشترکہ سیاسی مستقبل مسلمانوں کے لیے دشوار ہو گا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (1886ء) نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی روایت قائم کی، جس کے سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں ہوتے تھے۔ اسی کانفرنس کے ڈھاکہ اجلاس کے موقع پر، نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر، مسلم رہنماؤں نے الگ سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ آغا خان کو اس کا پہلا صدر اور محسن الملک کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ یوں لیگ کسی اچانک جذبات کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ نصف صدی کی فکری و تعلیمی جدوجہد کا سیاسی ثمر تھی۔

قیام کے سیاسی اسباب

سیاسی اسباب میں سب سے بڑا سبب نمائندگی کا مسئلہ تھا۔ جمہوری اصول کے تحت اکثریت کی حکومت کا مطلب تھا کہ مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہ کر دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم سے مسلمانوں کو مشرقی بنگال میں انتظامی سہولت ملی، مگر ہندو رہنماؤں اور کانگرس نے اس کی شدید مخالفت کی، جس سے مسلمانوں کو اندازہ ہوا کہ ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے اپنا پلیٹ فارم ضروری ہے۔ اسی دور میں ایک وفد سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا (1906ء) اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ پیش کیا، جسے اصولی طور پر قبول کیا گیا۔ اس کامیابی نے رہنماؤں کو یقین دلایا کہ منظم سیاسی جدوجہد سے حقوق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف کانگرس کے بعض حلقوں کا رویہ، ہندی اردو تنازع اور مقامی سطح کے فرقہ وارانہ اختلافات بھی لیگ کے قیام کو تیز کرنے والے عوامل بنے۔

تعلیمی و معاشی پسماندگی کا احساس

لیگ کے قیام کا ایک سبب مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی بھی تھی۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں، وکالت، تجارت اور جدید تعلیم میں اپنی آبادی کے تناسب سے بہت پیچھے تھے۔ سیاسی بے بسی اس پسماندگی کو مزید بڑھا رہی تھی، کیونکہ حکومتی پالیسی پر اثرانداز ہونے کے لیے سیاسی تنظیم ناگزیر تھی۔ بزرگ رہنماؤں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمان ایک آواز ہو کر اپنے مطالبات پیش نہیں کریں گے، حکومت ان پر توجہ نہیں دے گی اور دوسری جماعتیں ان کا استحصال کرتی رہیں گی۔ لیگ نے اسی لیے اپنے پروگرام میں تعلیم کے فروغ اور ملازمتوں میں مناسب نمائندگی کو بھی شامل رکھا۔ بنگال اور پنجاب کے مسلم زمیندار، تاجر اور نوابین نے مالی مدد فراہم کی، جبکہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس کی فکری قوت بنا۔ یہ اشتراک اس بات کا ثبوت ہے کہ لیگ صرف سیاسی نعرہ نہیں بلکہ قوم کی مجموعی ترقی کا منصوبہ بن کر ابھری۔

مسلم لیگ کے مقاصد

مسلم لیگ کے ابتدائی آئین میں تین بڑے مقاصد درج تھے۔ پہلا مقصد برطانوی حکومت کے لیے مسلمانوں میں وفاداری کے جذبات کو فروغ دینا اور حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرنا تھا۔ یہ اس دور کی عملی سیاست کا تقاضا تھا، تاکہ مسلمان انگریز کی بے اعتمادی سے نکل کر مذاکرات کی میز پر جگہ پائیں۔ دوسرا اور سب سے اہم مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور ان کی ترجمانی حکومت کے سامنے کرنا تھا۔ تیسرا مقصد دیگر قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا اور باہمی رواداری کو فروغ دینا تھا، بشرطیکہ مسلمانوں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔ ان مقاصد سے واضح ہے کہ ابتدائی لیگ علیحدہ وطن کا مطالبہ نہیں کر رہی تھی؛ وہ آئینی دائرے کے اندر مسلمانوں کی شناخت، نمائندگی اور حقوق کی ضمانت چاہتی تھی۔ جداگانہ انتخاب (1909ء) اس جدوجہد کی پہلی بڑی کامیابی تھی جس نے مسلمانوں کی الگ سیاسی حیثیت کو آئینی تسلیم دلا دیا۔

بعد کی پیش رفت اور اہمیت

آنے والے برسوں میں لیگ کی سیاست مقاصد میں وسعت لاتی گئی۔ 1913ء میں قائداعظم محمد علی جناح لیگ میں شامل ہوئے اور اسی سال لیگ نے خود حکومتی کا ہدف اپنایا۔ 1916ء کا میثاق لکھنؤ کانگرس اور لیگ کے درمیان سمجھوتے کی کامیاب مثال تھا جس میں کانگرس نے جداگانہ انتخاب قبول کیا۔ خلافت تحریک، نہرو رپورٹ کی مخالفت اور

قائداعظم کے چودہ نکات (1929ء) نے لیگ کو مسلمانوں کی واضح آواز بنادیا۔ 1930ء میں علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد نے الگ مسلم ریاست کا فکری خاکہ پیش کیا، اور 23 مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور کے ذریعے لیگ نے آزاد مسلم ریاستوں کا باضابطہ مطالبہ کر دیا۔ 1945–46ء کے انتخابات میں لیگ کی فیصلہ کن کامیابی نے ثابت کیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، اور بالآخر 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔ یوں جو جماعت حقوق کے تحفظ کے لیے بنی تھی، وہ حالات کے منطقی ارتقا سے وطن کی تخلیق تک جا پہنچی۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا قیام مسلمانوں کی سیاسی بے نمائندگی، تعلیمی و معاشی پسماندگی، اکثریتی جمہوریت میں حقوق ضائع ہونے کے خدشے اور بنگال کی تقسیم جیسے واقعات کا ردعمل تھا۔ اس کے ابتدائی مقاصد حکومت سے غلط فہمیوں کا خاتمہ، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ اور دیگر قوموں سے برابری پر مبنی تعلقات تھے۔ چار دہائیوں میں یہ جماعت قائداعظم کی قیادت میں پختہ ہوئی اور ایک آئینی جدوجہد کے ذریعے پاکستان کا قیام ممکن بنایا۔ اس لیے لیگ کے قیام کو برصغیر کے مسلمانوں کی جدید سیاسی تاریخ کا آغاز کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر 5

نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے چودہ نکات کا تقابلی مطالعہ کریں۔ (نمبر: 20)

تعارف

1920ء کی دہائی کے آخر میں ہندوستان کے آئینی مستقبل کا سوال پھر مرکز میں آیا۔ برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن بھیجا جس میں کوئی ہندوستانی شامل نہیں تھا، اس لیے بڑی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور خود متبادل آئینی خاکہ پیش کرنے کا چیلنج قبول کیا۔ اسی پس منظر میں 1928ء میں موتی لال نہرو کی سربراہی میں بنی کمیٹی نے نہرو رپورٹ

پیش کی۔ اس رپورٹ پر مسلمانوں کے تحفظات کے جواب میں قائداعظم محمد علی جناح نے مارچ 1929ء میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے۔ دونوں دستاویزات ہندوستان کے آئینی مسئلے کے دو مختلف تصورات کی نمائندہ ہیں۔ اس جواب میں پہلے دونوں کا تعارف کرایا جائے گا، پھر ان کا نکتہ بہ نکتہ تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں ان کے سیاسی نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔

نہرو رپورٹ: تعارف اور اہم سفارشات

نہرو رپورٹ نے ہندوستان کے لیے ڈومینین درجے کی خود حکومتی تجویز کی، یعنی برطانوی دولت مشترکہ کے اندر ایک خود مختار ریاست۔ اس نے وفاق کے بجائے بنیادی طور پر مضبوط مرکز والی وحدانی طرز کی حکومت تجویز کی جس میں بقایا اختیارات بھی مرکز کو حاصل تھے۔ انتخاب کے لیے مشترکہ انتخاب کا نظام رکھا گیا اور مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کو ختم کر دیا گیا؛ البتہ جہاں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں آبادی کے تناسب سے نشستوں کی محدود حفاظت کی گنجائش رکھی گئی، مگر پنجاب اور بنگال جیسے مسلم اکثریتی صوبوں میں ایسی کوئی ضمانت نہ دی گئی۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور سرحدی صوبے کو مکمل صوبائی درجہ دینے کی باتیں وقتی شرط سے مشروط کر دی گئیں۔ ہندی کو قومی زبان کی حیثیت دی گئی۔ مسلمان قیادت کو محسوس ہوا کہ یہ خاکہ اکثریت کی بالادستی کو مستقل شکل دے دے گا، کیونکہ جداگانہ انتخاب اور صوبائی خود مختاری جیسی حفاظتیں ختم کر دی گئی تھیں۔ دسمبر 1928ء میں کلکتہ کے کل جماعتی کنونشن میں قائداعظم نے ترمیمات پیش کیں مگر وہ مسترد ہو گئیں۔

چودہ نکات: قائداعظم کا جوابی خاکہ

قائداعظم کے چودہ نکات دراصل مسلمانوں کے کم از کم آئینی مطالبات کا مجموعہ تھے۔ ان میں کہا گیا کہ حکومت وفاقی ہو اور بقایا اختیارات صوبوں کے پاس ہوں؛ تمام صوبوں کو یکساں خود مختاری حاصل ہو؛ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو؛ جداگانہ انتخاب برقرار رہے جب تک کوئی قوم خود اسے چھوڑنا نہ چاہے؛ پنجاب، بنگال اور سرحدی صوبے میں مسلم اکثریت برقرار رکھی جائے؛ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے باقاعدہ صوبہ بنایا جائے؛ سرحدی صوبے اور بلوچستان میں دیگر صوبوں جیسی اصلاحات نافذ ہوں؛ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ ملے؛ مذہب، عبادت، تنظیم اور تبلیغ کی مکمل آزادی ہو؛ اور کسی بھی بل کو کسی فرقے کے تین چوتھائی ارکان کی

مخالفت پر ختم سمجھا جائے۔ یہ نکات علیحدگی کا اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی حفاظت کا آئینی فارمولا تھے۔ ان کی بنیاد یہ تھی کہ حقوق کی ضمانت صرف وعدوں سے نہیں، آئینی ڈھانچے سے ملتی ہے۔

تقابل: وفاق، مرکز اور نمائندگی

دونوں دستاویزات کا بنیادی فرق وفاق کے تصور میں ہے۔ نہرو رپورٹ نے مضبوط مرکز چاہا جس میں صوبے کمزور اکائیاں تھے؛ چودہ نکات نے حقیقی وفاق چاہا جس میں صوبے خود مختار اور مرکز محدود اختیارات کا حامل ہو۔ نمائندگی کے سوال پر نہرو رپورٹ نے مخلوط انتخاب نافذ کر کے مسلمانوں کی 1909ء سے ملی ہوئی حفاظت ختم کر دی، جبکہ چودہ نکات نے جداگانہ انتخاب اور مرکز میں ایک تہائی نمائندگی کو لازمی قرار دیا۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے معاملے میں رپورٹ نے پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب کی حفاظت سے بھی گریز کیا، جبکہ نکات نے ان صوبوں کی اکثریت کو ہر قسم کی حد بندی سے محفوظ رکھنے کی شرط رکھی۔ سندھ اور سرحدی صوبے کے مسئلے پر رپورٹ مبہم اور مشروط تھی، نکات اس میں واضح اور دوٹوک تھے۔ زبان اور ثقافت کے باب میں نکات نے اردو اور اقلیتی تہذیب کے تحفظ کی فضا پیدا کی جبکہ رپورٹ نے ہندی کو فوقیت دی۔ اس تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنازع محض انتظامی نہیں تھا؛ یہ اس سوال پر تھا کہ ہندوستان ایک قوم کی ریاست ہو گا یا دو بڑی قوموں کے حقوق کی ضمانت دینے والا وفاق۔

سیاسی نتائج: راستوں کا جدا ہونا

نہرو رپورٹ اور اس پر قائداعظم کی ترمیمات کی ناکامی ہندو مسلم آئینی مفاہمت کا آخری بڑا موقع ضائع ہونا تھی۔ قائداعظم نے اس مرحلے کو اپنی زندگی کا راستوں کے جدا ہونے کا مرحلہ قرار دیا، کیونکہ وہ جو مفاہمت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، مایوس ہو گئے۔ چودہ نکات اس کے بعد دو دہائیوں تک مسلمانوں کی سیاست کا منشور رہے؛ گول میز کانفرنسوں اور 1935ء کے ایکٹ پر بحث میں بھی انہی اصولوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ دوسری طرف کانگرس نے نہرو رپورٹ کو اپنا آئینی موقف بنا لیا اور 1929ء میں مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ یوں فاصلہ بڑھتا گیا اور بالآخر قرارداد لاہور (1940ء) میں مطالبہ حقوق کی حفاظت سے آگے بڑھ کر آزاد ریاستوں تک پہنچ گیا۔ مؤرخین

عموماً اس بات پر متفق ہیں کہ اگر 1928ء میں معقول حفاظتیں دے دی جاتیں تو شاید تاریخ مختلف ہوتی؛ مگر یہ قیاس ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق اپنے اصولوں پر ڈٹ گئے اور سمجھوتے کی گنجائش ختم ہو گئی۔

جدول: نہرو رپورٹ اور چودہ نکات کا موازنہ

پہلو	نہرو رپورٹ (1928ء)	قائداعظم کے چودہ نکات (1929ء)
طرز حکومت	مضبوط مرکز، وحدانی رجحان	حقیقی وفاق، بقایا اختیارات صوبوں کے پاس
انتخاب	مشترکہ انتخاب، جداگانہ انتخاب ختم	جداگانہ انتخاب برقرار
مرکز میں مسلم نمائندگی	کوئی مقررہ ضمانت نہیں	ایک تہائی سے کم نہ ہو
سندھ	مشروط و مبہم تائید	بمبئی سے الگ باقاعدہ صوبہ
مسلم اکثریتی صوبے	نشستوں کی حفاظت نہیں	پنجاب، بنگال، سرحد میں اکثریت محفوظ

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ نہرو رپورٹ اکثریتی جمہوریت اور مضبوط مرکز پر مبنی وحدانی خاکہ تھی جس نے مسلمانوں کی آئینی حفاظتوں کو ختم کر دیا، جبکہ چودہ نکات وفاقی نظام، صوبائی خود مختاری، جداگانہ انتخاب اور متناسب نمائندگی کے ذریعے ایک ہی ملک کے اندر مسلمانوں کے حقوق محفوظ کرنے کی سنجیدہ کوشش تھے۔ تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ دونوں دستاویزات کے درمیان اصل اختلاف اختیارات اور نمائندگی کے توازن کا تھا۔ ان نکات کی مسترد شدہ روح نے بعد کی سیاست کی سمت متعین کر دی اور دو قومی نظریے کو عملی آئینی مطالبے کی صورت دے دی، اس لیے ان دونوں دستاویزات کو تحریک پاکستان کے فکری سفر میں مرکزی مقام حاصل ہے۔